انیس ناگی کے ناول ''دیوار کے پیچھے'' میں وجودی مظہریت

حبیب الرحمٰن
پی ایچ ڈی سکالر، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Dr Anis Nagi is one of the giant literary figure of modern Urdu Literature in contemporary age. His contributions in the fields of modern Urdu Nove, Movement of New Poetry and translations of world literature are remarkable. In this article the element of existentialism in his novel "Deewar ke eechy" has been discussed."

انیس ناگی کے ناول ''دیوار کے پیچھے'' کا مرکزی کردار ایک پروفیسر کے وجودی مسائل اور شخصی زوال کی داستانِ الم ہے۔ وہ معاشرتی رویوں، نارسائی اور اپنے شعور کی سزا بھگت رہا ہے اور بالآخر انہی دیواروں کے ساتھ سر ٹکرا ٹکرا کر پاش ہو جاتا ہے۔ یہ ناول نہ صرف پروفیسر کے شخصی زوال کی کہانی ہے بلکہ تیسری دنیا کے اس معاشرے میں ہر اس شخص کی سرگزشت ہے جو شعور کا حامل ہے۔ سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور سچ بولنے کی عادت میں مبتلا ہے۔ معاشرے کے منافقانہ رویوں اور تضادات پر کھل کر بات کرتا ہے، آزادی اظہار کا قائل ہے، برابری کا خواہشمند ہے۔ اور پھر یہی شعور، یہی سچ بولنے کا ناقابلِ معافی جرم اور تنہائی میں سوچنے اور غور و فکر کرنے کی عادت اُسے فنا کے راستے پر لا کھڑا کرتی ہے۔ تنہائی، ذہنی انتشار، مایوسی، شکستگی، وجودی بحران، اور ناقابلِ برداشت کرب اور ناکردہ گناہوں کی سزا پروفیسر کا مقدر بن جاتی ہے۔ شب و روز کے اس بے معانی پھیلاؤ اور تسلسل میں اُس کا وجود ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ اس کی کل کائنات صرف اس کا شعور ہے۔ جو اس معاشرے میں کسی قیمت اور وقعت کا حامل نہیں۔ انیس ناگی کا یہ کردار یوں گویا ہوتا ہے:

> ''یہی شعور ہی میرا عذاب ہے، جس سے میں نجات حاصل نہیں کر سکتا، اس ہزار پایہ عفریت نے مرے جسم و جاں کو جکڑ لیا ہے۔ شاید کبھی کوئی بھی ایسی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوا ہوگا، کہ بیکار کی سوچ نے اس کی ہڈیوں کا برادہ بنا دیا ہو۔''[۱]

یہ ناول پروفیسر کی نامرادی، ہزیمت، تاراج ہوتے ہوئے شعور کی کتھا اور اس کے جاگتے ذہن کا تماشہ ہے۔ اس ناول کو بجا طور پر وجودی ناول کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مرکزی کردار شکستِ ذات اور اپنے ہی وجود کے بحران کا شکار ہے۔ یہ کرب انتہائی جان لیوا ہے۔ تنہائی، خوف اور دہشت اس کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ انتشار ہی انتشار ہے۔ ذات سے لے کر سوچ تک ہر جزوِ زندگی ملیا میٹ ہو رہا ہے۔ جبر اور ناکردہ گناہوں کی سزا میں ہر

گزرتے لمحے کے ساتھ بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے بدن کی عمارت شکستگی کی جانب زوال پذیر ہے۔ اس ناول میں مصنف نے دوستوویفسکی اور کامیو، ان دونوں ادیبوں کے کئی حوالوں کو اپنے اس ناول کا حصہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کو وجودی ناول قرار دیا گیا۔ انیس ناگی کا اپنا میلان بھی وجودی رویوں کی طرف بہت زیادہ رہا، انہوں نے مغربی ادیبوں کا بے تحاشہ مطالعہ کیا۔ دوستوویفسکی، کامیو، کافکا اور سارتر جیسے وجودیت پسند ادیب ان کے پسندیدہ مصنف تھے۔ انیس ناگی ان کے نظریات سے بے حد متاثر ہوئے۔ ان کی تحریروں کا عکس یا اثرات انیس ناگی کے ناولوں میں تلاشے جا سکتے ہیں۔ اس ناول کا ہیرو ہر وقت وجودی کرب میں مبتلا ہے، جو ہمہ وقت خوف، زوال اور خطرے کی زد میں ہے، وہ لایعنیت کا کرب جھیل رہا ہے وہ بقا سے فنا کے راستے کا مسافر ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر کا وجودی کرب ملاحظہ کیجیے:

> '' کائنات کی ہر چیز اپنے معانی سے عاری ہوتی جا رہی ہے اور میرا وجود لایعنی صورتِ حال بنا جا رہا ہے اور اس سے فرار کیونکر ممکن ہے.....؟ اوہ راتوں کی تیرگی مجھے اپنی پناہ میں لے۔ میں ہر ایک چیز سے تھک گیا ہوں۔ اپنے آپ سے بھی اور ان سے بھی جن کے درمیان مجھے رہنا ہے۔ اے آتشِ سیال مجھے اس طور پر منتشر کر دے کہ مجھے پھر اکٹھا نہ کیا جا سکے اور پھر میں ہوش سے عاری ایک بچے کا ذہن لے کر انہی سڑکوں پر دیوانہ وار پھروں اتنا کہ شناخت کے سب قرینے محو ہو جائیں۔ شعور اور وجود کے درمیان کھنچی ہوئی لکیر کو منہدم کر دوں ہر اثبات سے انکار کروں اور ہر انکار سے اثبات کا قرینہ اخذ کروں۔ اے راتوں کی رات! تو میرے ماضی کو مجھ سے میرے مستقبل سے میری سوچ کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دے کہ دوسرے میرا جہنم ہیں اور میں ابتر ہوں ایک باغ کی طرح جس کے برگ و بار تیز آندھی سے الجھ گئے ہوں۔ میں اور کچھ نہیں دیکھنا چاہتا کہ دیکھنا تجربہ کرنا ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے اسے اور دیکھنا نہیں چاہتا، جو کچھ دیکھ چکا ہوں اس میں صرف اتنی معنویت ہے کہ اس میں کوئی معنویت نہیں ہے۔''[۲]

یہ فرد کا وجودی بحران ہے، پروفیسر کا وجودی کرب ہے کہ زندگی بذاتِ خود اس کے نزدیک اپنی معنویت کھو چکی ہے اور ان حالات سے تنگ آ کر مرکزی کردار خودکشی کی کوشش بھی کرتا ہے اور خود کو موت کے حوالے کر دیتا ہے مگر موت بھی اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ پروفیسر زندگی نہیں چاہتا پھر بھی اسے جینا پڑتا ہے۔ اضطراب، انتشار، قنوطیت اور مایوسی کے گہرے گھنے سایوں میں اسے جینا پڑتا ہے۔ حمیرا اشفاق ناول ''دیوار کے پیچھے'' میں موجود وجودی عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> '' اس ناول میں فرد کے وجودی بحران اور کرب کا اظہار ملتا ہے۔ اس کا مرکزی کردار

پوری سچائی کے ساتھ اپنی مرضی سے زندہ رہنا چاہتا ہے لیکن معاشرے میں اس سچے
آدمی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا سامنا ایسے نظام سے ہوتا ہے جو غیر
جمہوری، غیر منصفانہ اور منافقت سے پُر ہے۔'' ۳

ہر صاحب شعور زندگی کی معنویت کا متلاشی ہے۔ پروفیسر بھی زندگی کے معانی تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اس تلاش کے لیے حتی کہ وہ اپنی زندگی خودکشی کے راستے پر ڈال کر زندگی کے معنوں سے آشنا ہونا چاہتا ہے لیکن خودکشی لایعنیت کا حل نہیں، وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے اس کی گمشدگی بھی زندگی اور شعور کی گمشدگی کی علامت ہے ۔ جبر سے تنگ آ کر خود سے کنارا کرنا مشکل کام ہے۔ مگر ناول کا ہیرو اس سے بھی گریز نہیں کرتا۔ قاضی جاوید ناول میں وجودیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'' اس ناول میں فرد کے وجودی بحران اور کرب کا ادبی اظہار ملتا ہے۔'' ۴

اس ناول کی پوری کہانی بھی پروفیسر کے داخلی انتشار اور وجودی کرب کی نمائندہ ہے۔ ناول کا آغاز پروفیسر کی گمشدگی سے ہوتا ہے اور پروفیسر اپنے دوست احمد کے نام ایک سربمہر بنڈل چھوڑ جاتا ہے جو کٹے پھٹے کاغذات پر مبنی ہے دراصل یہ کاغذات (دیوار کے پیچھے) کا مسودہ اور ساتھ ایک تحریر بھی ہے جس کا متن یوں ہے:

'' ۔۔۔۔احمد، احمد میں بہت منتشر ہوں، تھکا ہوا، بے مراد منکر ہوں، میرے اندر خلا ہی
خلا ہے، میں حقیقت بننا چاہتا تھا مجھے روک دیا گیا۔ نہ جانے کیوں ابھی تک میرے خلیوں میں
زندگی کی رطوبت باقی ہے۔ میں نے اپنا حساب چکا دیا ہے، میرا کوئی مطالبہ نہیں میں زندہ رہنا
نہیں چاہتا تھا اس کے باوجود زندگی نے مجھے کہا کہ اسے میری ضرورت ہے کیسا اتفاق ہے نا کہ
مجھے اپنی ضرورت نہیں ہے میری موجودگی پر کیوں اسرار کیا جا رہا ہے؟'' ۵

پروفیسر شطرنج کی بازی پر ہارا ہوا وہ مہرہ ہے شکست جس کا نصیب ہوتی ہے، ساتھ ہی نا آسودگی کا زہر رگوں میں پھیلتا جاتا ہے اور اس کے لیے زندگی اور اس کی رنگا رنگی کا کوئی بھی تجربہ خوشگوار نہیں۔ اس کے سب نظریات اور آدرش ریت کی دیوار ثابت ہوئے، زندگی اور بے روزگاری کی تلخ حقیقتیں اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ تنہائی اور کرب من کے آنگن میں اتنا سرایت کر چکا ہے کہ واپسی کا اب کوئی امکان نہیں ہے ۔ مالی بحران، مایوسی، دل گرفتگی، بے مقصدیت اور لایعنیت کی دلدل میں دن بہ دن الجھتے بلکہ ڈوبتے ہوئے پروفیسر کی زندگی کی طرف مراجعت اور واپسی کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ یہ سچ بولنے کا جرم ہے، یہ شعور کی سزا ہے ، یہ جاگتے ذہن کا تماشا ہے، یہ پروفیسر کا وجودی بحران ہے جو اسے پوری طرح نگل چکا ہے۔ پورے ناول میں پروفیسر کا کردار ایسی شخصیت کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے جسے سچ بولنے کی عادت ہے، حق پرستی و حق گوئی کی بنا پر ہی اسے ملازمت سے برخاست کر دیا جاتا ہے۔ بورس پیستر ناک (Boris Pasternak) نے فروری ۱۹۵۹ء

میں نیویارک ٹائیمز کو ایک انٹرویو دیا
جس میں انہوں نے کہا تھا:

"In every generation there has to be some fool who will speak the truth as be see it." ۶

پروفیسر اس مقولے کی عملی مثال ہے جو پورے ناول میں اپنے سچ کی سزا بھگتتا ہوا نظر آتا ہے۔ سچ بولنے کی بنا پر اس پر ناپسندیدہ اور مشکوک ہونے کا فردِ جرم عائد کر دیا جاتا ہے کہ وہ موجودہ نظام کے خلاف نفرت پھیلا رہا ہے۔ اس کے خیالات اور نظریات نہایت آزادانہ ہیں۔ اسی جرم کی پاداش میں اسے کالج سے علیحدگی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ زندگی اور پروفیسر کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے جسے پاٹنے کے لیے وہ ہزار جتن کرتا ہے مگر اس کا ہر حربہ اور کوشش ناکام رہتی ہے۔ پروفیسر زود رنج، حساس اور دوہرے رویوں سے شاقی ہو جاتا ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ اور اس کا وجود اندھیروں میں ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ ناامیدی، نامرادی اور ہزیمت اس کا پیچھا چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ خوف اور دہشت کی فضا ہر طرف سرسرانے لگتی ہے اور وہ اسی مسموم فضا میں سانسیں گننے لگتا ہے۔

''دیوار کے پیچھے'' میں پروفیسر کا کردار اور معاشرے کا تصادم، فرد کا اپنی ذات سے تصادم، انسانی نفسیات اور خودغرضی، منافقانہ رویوں، حرص، لالچ، خانگی رشتوں کی خودغرضی وٹوٹ پھوٹ اور عدالتی نظام میں انصاف کی گمشدگی، جاگیردارانہ نظام اور بے رحم سماج کو بے نقاب کرتا ہے اور ان بے رحم رویوں سے پردہ اٹھاتا ہے جو انسانیت کی توہین ہیں۔ اس کردار کے ذریعے ''دیوار کے پیچھے'' میں جدید عہد میں ٹوٹ پھوٹ کے شکار جدید فرد کے انتشار کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ محبت اور خلوص سے کھوئی ہوئی قدروں کا نوحہ بھی تحریر کیا گیا ہے۔ پروفیسر ایسے ماحول میں جیتا ہے جہاں ہر رشتہ غرض اور ضرورت پر استوار ہے۔ زوال ہی زوال ہے۔ خاندانی رشتے اور اقدار سب بے معنی ہیں، سب اپنا مفہوم کھو چکے ہیں۔ محبت، خلوص، بے غرضی، قربانی جیسے فلسفے اور اقدار قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اس کا وجود گھر میں کسی اہمیت کا حامل نہیں بلکہ انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ وہ محبت اور نفرت کے دوہرے رشتے کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اسکی بہن کا رشتہ اس وجہ سے نہیں ہو پاتا کہ پروفیسر اس کے سسرال والوں کو یہ سچ بتا دیتا ہے کہ اس کی بہن مرگی جیسے مرض میں مبتلا ہے۔ سچ بولنے کی پاداش میں سب کی نگاہوں میں ناپسندیدہ ٹھہرتا ہے۔ ہر طرف سے لعن طعن برداشت کرنا پڑتی ہے، مزاحمت کو گلے لگانا پڑتا ہے اور وہ سب کی نگاہوں میں مردود ٹھہرتا ہے۔ بے بسی، لاچاری، ناکردہ گناہوں کی سزا، لامتناہی تنہائی اور جبر اس کا اثاثہ ہیں۔ بالآخر پروفیسر معاشی جبر کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور اپنی شکست کا اعتراف کر لیتا ہے، کیونکہ وہ مکمل طور پر ٹوٹ چکا ہے۔ اب تو اس کی بیکاری کو دیکھ کر گھر کے ہر فرد کی پیشانی پر بل پڑنے لگتے ہیں اور خود بھی بیکاری کے بوجھ کو زیادہ

برداشت نہیں کر پاتا۔ وہ اپنے دوست احمد کے ذریعے عدالتی نظام کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا ہے کہ مزید نارسائی ،نراج اور زہر اس کا مقدر بن جاتا ہے ۔ چوہدری جیسے ناسور اے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جھوٹی شہادتیں اور گواہیاں عدالتی نظام پر سوالیہ نشان ہیں۔ جہاں انصاف ملنے کی توقع ہو اور وہاں اگر انصاف سستے داموں فروخت ہونے لگ جائے تو زندگی اور موت کے درمیان حدِ فاصل ختم ہو جاتی ہے اور انسانیت اور اقدار کے تمام فلسفے دم توڑ جاتے ہیں۔ ناول میں احمد اور چوہدری کا کردار عدالتی نظام میں بکنے والے انصاف اور جھوٹ کا سہارا ہیں۔ چوہدری اس معاشرے میں طاقت اور شر کا نمائندہ ہے جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کسی کو بھی تباہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ پروفیسر معاشی جبر کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوری طرح چوہدری کے شکنجے میں آ جاتا ہے۔ جبکہ احمد اور پروفیسر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں کا نظریہ زندگی اور فلسفہ زیست ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ سب مل کر پروفیسر کی شخصیت کا کچومر نکال دیتے ہیں۔ پروفیسر کو جب احمد اور چوہدری کی خاطر مخبری کرنے کے عوض اسے رقم مہیا کی جاتی ہے تو یہ عمل اس کی روح کو خالی کر دیتا ہے اور یوں اس کی زندگی نارسائی اور لایعنیت کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتی ہے۔ ہر طرف خلا ہی خلا ہے جسے وہ لکھے ہوئے مقدر کے طور پر قبول کر لیتا ہے اور وہ یہ کہتے ہوئے چیخ اٹھتا ہے:

> ''میں پہلے سالم تھا پھر مجھے مسمار کر دیا گیا اب کچھ بھی نہیں ہوں۔''[۷]

یہ ایک جملہ پروفیسر کے وجود کے انہدام اور کرب کی پوری تصویر عیاں کرتا ہے۔ دہشت اور گھٹن زدہ ماحول چاروں طرف حاوی ہے اور وہ اس کی زد میں ہے۔ اس ناول میں وجودی اظہار پوری طرح عیاں ہے۔ ناول میں وجودی عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں:

> ''اس نامنصفانہ و غیر متوازن سوسائٹی میں پروفیسر جیسے باشعور لوگ یا تو پاگل ہو یا ہو جاتے ہیں یا الکوحلک ، کیونکہ کہ اس معاشرے میں فرد کی آگہی اور احساس اس کے لیے عذاب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے تنہا اور کٹا پھٹا ہوا فرد اپنی ذات کے نہاں خانوں کا اسیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ تنہائی اور ترسیل کی ناکامی پروفیسر کا مقدر ہیں۔''[۸]

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیس ناگی کا ناول ''دیوار کے پیچھے'' ایک وجودی ناول ہے جو اردو ناول کی روایت سے ہٹ کر تحریر کیا گیا ہے۔ روایت سے ہٹ کر سوچنا اور لکھنا انیس ناگی کا پسندیدہ مشغلہ رہا۔ یہ ناول اردو ناول کی روایت سے انحراف کی عمدہ مثال بن کر سامنے آیا۔ جدید عہد کا انسان جس وجودی بحران اور داخلی کرب میں مبتلا ہے وہ اس ناول کا مرکزی نقطہ ہے۔ انیس ناگی نے روایتی ناول کو رد کر ڈالا اور عشق و محبت کے فرسودہ موضوعات کی بجائے اپنے ناولوں کی بنیاد ان ٹھوس عقائد اور مسائل پر رکھی جن سے آج کا جدید آدمی دوچار ہے۔ اور یہی وجہ ان کو اردو ناول میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

حواشی:

۱۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، (لاہور: فیروز سنز، ۱۹۸۰ء)، ص: ۵۷
۲۔ ایضاً، ص: ۸۴
۳۔ حمیرا اشفاق، جدید اُردو فکشن عصری تقاضے اور بدلتے رجحان، (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، اکتوبر ۲۰۱۰ء) ص: ۱۰۴
۴۔ قاضی جاوید، انیس ناگی ایک وجودی ناول نگار، مرتب، زاہد مسعود، (لاہور: حسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء)، ص: ۱۴
۵۔ ایضاً، ص: ۷
۶۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، اُردو ناول کے بدلتے تناظر، (لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی، ۲۰۰۷ء)، ص: ۲۲۲
۷۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، ص: ۱۳۸
۸۔ خالد اشرف، برصغیر میں اُردو ناول، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء)، ص: ۸۳

مآخذ:

۱۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۸۰ء۔
۲۔ حمیرا اشفاق، جدید اُردو فکشن عصری تقاضے اور بدلتے رجحان، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، اکتوبر ۲۰۱۰ء۔
۳۔ قاضی جاوید، انیس ناگی ایک وجودی ناول نگار، مرتب زاہد مسعود، لاہور: حسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء۔
۴۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، اُردو ناول کے بدلتے تناظر، لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی، طبع ثانی ۲۰۰۷ء۔
۵۔ خالد اشرف، برصغیر میں اُردو ناول، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء۔

☆☆☆